ڈاکٹر غفور شاہ قاسم
استاد شعبہ اردو، ایف سی کالج (یونیورسٹی) لاہور

شاہین عباس کی افسانہ نگاری۔ ایک تحقیقی، تجزیاتی مطالعہ

Dr. Ghafoor Shah Qasim
Department of Urdu, F.C College (University), Lahore.

Shaheen Abbas as a Short Story Writer

Shaheen Abbas is one of the repseentative poets of our times. His work in modern Ghazal and Nazam is highly acknowledged and appreciated. Urdu critics cannot ignore his contribution in these genres. Now he has discovered his new dimension in short story writing. His way of writing is not traditional. His technique and treatment is entirely unique. In this article the write has critically analyzed his published as well as unpublished short stories.

جدید اردو غزل اور نظم میں اپنا انفرادی تخلیقی تشخص وضع کر لینے کے بعد شاہین عباس نے نثر کی صنف افسانے کو اپنی تخلیقی صلاحیتوں کے اظہار کا وسیلہ بنایا ہے۔ ان کی افسانہ نگاری اردو افسانے کی جدید روایت کی بھرپور نمائندگی کرتی ہے۔ تمثیل، علامت، استعارہ اور معنیاتی تہہ داری، ان کے افسانوں کی نمایاں خوبیاں ہیں۔ شاہین عباس کا فن حیات و کائنات کی ارضی صداقتوں کا عکاس ہے۔ ان کے افسانوں میں ماضی، حال اور مستقبل کی مثلث کے تینوں زاویے ایک دوسرے کے ساتھ مضبوط رشتوں میں جڑے ہوئے ہیں۔ انسانی تہذیب و تمدن کی ارتقائی تاریخ اور انسانی معاشرت کے فکری اور ذہنی رویے شاہین عباس کی افسانہ نگاری کا خاص موضوع ہیں۔

پاکستانی افسانہ نگاروں کی صف میں شامل ہونے والے نئے افسانے نگار شاہین عباس کی منظومات پر مشتمل دوسرے مجموعہ "درس دھارا" سے ان کی افسانہ نگاری کی شروعات کا کھوج لگایا جا سکتا ہے۔ اس مجموعے کی متعدد نظموں میں کہانی کی طرز کا پھیلاؤ ملتا ہے۔ ان میں بعض نظمیں کرداری نوعیت کی ہیں اور کچھ نظمیں ایسی بھی ہیں جو واحد متکلم کے صیغے میں ہوتے ہوئے بھی اپنے اندر ایک افسانوی اسلوب لیے ہوئے ہیں اول الذکر نظموں میں سے کچھ نام یہ ہیں۔ "دانولی سوار"۔ "بیس گرام بال"، "والناس تک"، "چوپایوں کا مخروط"، "کچرے پہ جھگڑا" اور "یہ وَلیے کا چکر" وغیرہ۔ جب کہ ثانی الذکر نظموں میں تو شاید پوری کتاب ہی کا حوالہ دیا جا سکتا ہے۔ اسی کتاب کے تجربے سے گزرتے ہوئے شاہین عباس کو یہ احساس ہوا کہ اندر کہ کہانی ابھی چل رہی ہے سو انھوں نے غزل اور نظم کے کم و بیش تیس پینتیس سالہ پس منظر کے ساتھ

افسانہ لکھنے کا آغاز کیا۔ ناقدین ادب نے ان کے افسانوں کی تکنیک اور ٹریٹمنٹ پر بطورِ خاص توجہ دی ہے۔ ان کا افسانہ بیک وقت فکشن، میٹا فکشن اور اپنی آخری منزل پر الٹرا فکشن بن جانے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ انہوں نے جن موضوعات پر لکھا وہ نہ تو رسمی ہیں نہ روایتی۔ اس لیے جن پیچیدہ موضوعات کو وہ اپنے افسانے میں پیش کرنا چاہتے تھے وہ محض فکشن کی روایتی اور رسمی تکنیک کے ساتھ پیش کرنا چاہتے تھے وہ محض فکشن کی روایتی اور رسمی تکنیک کے ساتھ پیش نہیں کیے جاسکتے تھے چنانچہ آپ کو ان کے افسانوں میں ایک نئی فضا، نیا ماحول، نیا اسلوب اور بالکل نئی تکنیک دکھائی دے گی۔ ہمارے ایک سوال کے جواب میں شاہین عباس نے بتایا:

"کہانی کو تمام تر جزئیات کے ساتھ حسبِ منشا تسلسل کی حالتیں برقرار رکھتے ہوئے لکھنے کا تجربہ کرنا ہو تو افسانے کی صنف نظم کے مقابلے میں زیادہ موزوں ہے۔ یہ مساعی میں نے ایک سطح پر نظم میں بھی کی ہیں اور غزل میں بھی۔ اب آپ پوچھیں گے کہ تسلسل تو ہوا، یہ عدم تسلسل کیا چیز ہے۔ بس یہیں سے میرا اور قاری کا اختلاف شروع ہوتا ہے۔ جب تک ہم کلائمیکس اور اینٹی کلائمیکس کے طے شدہ قواعد سے باہر نہیں نکلیں گے، یہ اختلاف رہے گا۔ تخلیقی تجربہ محض لکھتے رہنے کا نام نہیں، بلکہ توقف، تعطل اور خاموشی کا درجہ بھی عملِ تخلیق کے برابر ہے، بس ذرا ان مقامات کی نشاندہی کی ضرورت ہے۔ میرا اصرار یہ ہے کہ جیسے وجود اور عدم باہم مل کر آفرینش کے اولین تصور کو مکمل کرتے ہیں، اسی طرح تخلیقی تجربے کے ساتھ بھی غیاب کا ایک لاحقہ جڑا ہوتا ہے جس کی شناخت کا انحصار تربیت کے روایتی عمل پر نہیں، بلکلی غیر رسمی طرز فکر پر ہے۔ افسانہ میرے نزدیک "غیر حاضر"، "ناموجود" اور "نامعلوم" کی نازبرداری کا معاملہ ہے، اور یہ معاملہ محض سیر بیابان وگلستان سے نہیں نپٹایا جاسکتا، بلکہ خود بیابان وگلستان بنناپڑتا ہے۔ افسانہ نگار اپنے ہم عصروں سے کیونکر اور کس حد تک مختلف ہونا چاہیے، اس کا انحصار شخصی سطح کی انفرادیت پر ہوتا ہے۔ اگر میں یہ تخمینہ لگانے میں کامیاب ہو گیا کہ میں نے شاعری میں کیا کہا ہے، تو یہ طے کرنا بھی آسان ہو گا کہ میں نے افسانے میں کیا کہنا ہے۔ بس اتنا کہوں گا کہ زندگی کو مشکل سے مشکل تر کرنے کا جو موقع بھی ملا ہے، ضائع نہیں کیا"۔ (۱)

شاہین عباس کے تخلیقی سفر پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ واقعی انھوں نے اپنی زندگی کو مشکل سے مشکل تر بنانے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ وہ کن بڑے افسانہ نگاروں سے انسپائر ہوئے ہیں۔ ہمارے ایک سوال کے جواب میں وہ کہتے ہیں:

"مجھے فرانز کافکا، مارکیز، بورخیس، قراۃ العین حیدر، نیر مسعود، اور چیخوف نے بطورِ خاص متاثر کیا۔ ان کی کہانیوں میں تاریخ کی دھول اُڑا کر داد پانے والی صورت نہیں بلکہ کہانی کی فضا بندی کی بہت الگ صورت نظر آتی ہے۔ جو کہ آرٹ کا اصل ہے"۔ (۲)

شاہین عباس مختلف اور منفرد افسانہ نگار ہیں۔ ان کی افسانوی تکنیک اور موضوع کی ٹریٹمنٹ بھی خصوصی توجہ کی طلب گار ہے "درس دھارا" کے فلیپ پر اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے شناور اسحاق نے لکھا:

"متعدد نظمیں ایسی ہیں جن میں شاعر نے اپنے ماضی کے کچھ کرداروں کی بازیافت کی ہے۔ جیسے "مستری بندے علی"، "کاکا نواب"، "ولیا"، ناظرہ بی بی"، "قاسم شاہ"، "خورشید بی بی"، ہو سکتا ہے یہ کردار فرضی ہو یا بدلے ہوئے ناموں کے ساتھ جلوہ گر ہوئے ہوں۔ یہاں شاہین کے باطن میں موجود افسانہ نگار اور شاعر بغل گیر ہوتے دکھائی دیتے ہیں"۔ (۳)

شاہین عباس کے افسانوں کے واقعات زندگی کا سچا عکس معلوم ہونے کے باوجود عمومی زندگی سے بالکل مختلف نظر آتے ہیں۔ ان کا قاری کبھی کبھی یہ محسوس کرنے کے باوجود کہ وہ جس دنیا کی سیر کر رہا ہے وہ اس کی اپنی دنیا سے قدرے مختلف ہے۔ اپنے آپ کو اس دنیا میں گم ہوتا محسوس کرتا ہے۔ شاہین عباس کی مشاہداتی نگاہ منظر کی گہرائی تک اترتی چلی جاتی ہے اور احساسات کی دھڑکنوں تک کو گن لینے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ ان کا افسانہ "حجر سفیدی اور سیاہی"، گہری رمزیت، ایمائیت کا حامل اور تخلیقی تہہ داری کا خوبصورت نمونہ ہے۔ گہری معنویت سے بھرپور یہ اقتباس دیکھ لیجئے:

"مگر ادھر کالر سے ایک چیونٹی کو جھاڑا تو ادھر دو اور آنے لگیں۔ دو گئیں تو لشکر کے لشکر صفیں باندھے بدن کی سیڑھیوں پر آٹا چگنے چلے آئے۔ معلوم نہیں سیڑھیوں کے کنارے کنارے بال برابر باریک لکیر کے بننے میں کتنا آٹا استعمال ہوا تھا، جس کے سفید ذروں سے ہزاروں چیونٹیاں اپنا اپنا ڈنک بھرنے آ گئیں۔ کونوں کھدروں میں سے خوابیدہ ہوائیں سر اٹھانے لگیں، جیسے خفیہ رپورٹر ہوں اور پہلی بار نظر آئے ہوں۔ اور اب ان کا ثبوت جرم پر انعام پانے کا وقت آ گیا ہو۔ احاطہ آسمانی جھولے کی طرح، دائرہ در دائرہ، لکیر در لکیر جھول اٹھا تھا۔ دائیں بائیں شجر کرمانی کی جیتی جاگتی مخلوق کا کھوے سے کھوا اچھل رہا تھا اور کھڑکیوں پر پڑے پردے بے دھڑک ہر چیز کو بے پردہ کیے دے رہے تھے۔ وہ اٹھا اور اپنے بندوں کی صفیں چیرتا ہوا خود کو گھر سے باہر نکال لایا۔ "دیر نہ کیجئے۔ ہم بس تھوڑی ہی دیر ہیں آپ کی بستی میں چلے جائیں گے۔ اگلے برس نہ بستی ہو گی نہ ہم ہوں گے!"۔ (۴)

شاہین عباس تخلیقی نثر لکھنے کا سلیقہ رکھتے ہیں، ایک فضا بنانا جانتے ہیں، تاثر کو گہرا اور دیرپا بھی کر دیتے ہیں لیکن بعض مقامات پر تکرار بھی محسوس ہوتی ہے اور کہیں کہیں لگتا ہے کہ افسانہ نگار یا اس کا متکلم لذتِ کلام میں کھو کر اس بات

سے بے نیاز ہو جاتا ہے کہ اس کے تخلیقی تجربے میں بے ساختہ شرکت کیلیئے کتنے لوگ رہ گئے ہیں۔ شاہین عباس کبھی کبھار افسانہ نگار سے زیادہ ایک مضطرب معلم ہو جاتے ہیں جو چاہتے ہیں کہ ان کے شاگرد نہ صرف کچھ مشکل الفاظ اور اصطلاحوں کے معانی سے واقف ہو جائیں بلکہ کچھ کتابوں اور علمی حوالوں سے بھی آشنا ہو جائیں اور کبھی نہ بھولیں کہ اس مردم خیز خطے کا کوئی مثیل نہیں۔

جدید افسانے کہانی کے مروجہ فارمولے کو توڑ کر اسے ایک نئی شکل عطا کر دی ہے۔ نئے افسانہ نگاروں خصوصاً شاہین عباس نے افسانے کی روایتی ترتیب اور انضباط سے انحراف کیا اور کہانی کی اٹھان کے اس مرکزی نقطے سے بھی جو ٹھوس مظاہر کا مرکب تھا۔ انہوں نے واقعہ کی بجائے اس کے تار کو اہم سمجھا اور واقعاتی تسلسل کی بجائے خیال اور احساس کے تسلسل کو اہمیت دی۔ ظاہر ہے خیال اور احساس کی حیثیت باطنی اور باطن کی ترتیب و تنظیم خارج سے بالکل مختلف چیز ہے۔ تاہم انھوں نے احتیاط اور توازن کو برقرار رکھا اور افسانے کی مرکزی اکائی کو اپنے ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔ اس طرح افسانے میں کہانی پن کا نیز ذائقہ متعارف کرایا۔ ہمارا مطالعہ یہ بتاتا ہے کہ شاہین عباس مختصر افسانوں کی بجائے قدرے طویل افسانوں کی طرف راغب دکھائی دیتے ہیں۔ ان طویل افسانوں میں ان کے افسانے "بیوہ کا بگھار"، "ایڈیٹنگ"، "لیمہ"، "یکہ بان"، "سرخ آب سپرِ دِ خاک"، وغیرہ شامل ہیں۔ یہ افسانے ان کے اندر کے ناول نگار کی خبر دے رہے ہیں۔ ممکن ہے مستقبل میں وہ ایک شاہکار ناول یا ناولٹ لکھنے میں کامیاب ہو جائیں۔ اس مقام پر ان کے انٹرویو کا یہ اقتباس نہایت موزوں دکھائی دیتا ہے۔ ملاحظہ کیجئے:

> "ڈاکٹر ناصر عباس نیر اور عاصم بٹ کی رائے بھی یہی ہے کہ غزل، نظم اور افسانے کے بعد اب ناول کا جواز پیدا ہوتا نظر آتا ہے۔ میرا اپنا خیال یہ ہے کہ کسی مضمون، موضوع یا تجربے کو انگلی پکڑ کر زیادہ دیر تک اپنے تابع نہیں رکھا جا سکتا۔ تخلیقی تجربہ اپنے امکانات کی بنیاد پر از خود اپنی فارم کا تعین کر سکتا ہے یوں سمجھیے کہ جس طرح انسان آزاد پیدا ہوا ہے، اس کے اندر سے برآمد ہونے والا ہر موضوع اور مضمون آزاد ہوتا ہے، جو کسی غیر فطری اور غیر تخلیقی بندش کو خاطر میں نہیں لاتا۔ ادب اور تخلیق ادب کا عمل تین گھنٹے میں حل طلب سوالات کے جوابات کو پرچے پر لکھ کر پرچہ ممتحن کے حوالے کر دینے کا نام نہیں، بلکہ یہ کبھی نہ ختم ہونے والا ایسا سوالنامہ ہے جس کے حاشیوں میں بھی سوال درج ہیں اور سوالوں کے درمیان کی خالی جگہوں پر بھی سوال لکھے ہوئے ملتے ہیں۔ مجھے خود بھی اندازہ نہیں کہ دل میں آئی ہوئی بات کہاں تک لکھ کر قلم روک دوں کہ افسانہ بن جائے اور بڑھتا ہوا کہاں تک لے جاؤں کہ کسی طویل بیانیے کی صورت اختیار کر جائے۔ خود پر یہ عدم اعتماد میرے لیے ایک پر لطف تجربہ ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ آج کل افسانوں کے ساتھ ساتھ ایک ناول پر بھی کام چل رہا ہے"۔ (۵)

شاہین عباس نے افسانوی متن کو نقطہ آغاز اور انجام کی قید سے آزاد کر دیا ہے کہان کے تسلسل اور وحدت تاثر کی روایتی تقسیم کو بھی ختم کر دیا ہے، یوں انہوں نے اردو افسانے کیلیے ایک نئی فضا بندی کا راستہ کشادہ کیا ہے۔ان کا افسانوی ڈکشن منفرد ہے اور کرافٹ بے مثال۔انھوں نے جس افسانوی فضابندی کو رواج دیا ہے اوہ اپنا پلاٹ، کردار، مکالمہ، متن اور افادیت اپنے ساتھ لے کر آتی ہے۔

شاہین عباس نے اب تک بارہ معیاری افسانے تحریر کیے۔ اتنے کم افسانوی سرمائے کے باوجود افسانہ اختصاصی مطالعے کا تقاضا کرتا ہے ان کے یہ افسانے ادبیات، اسلام آباد (شمارہ نمبر ۱۰۵)، کاغذای پیرہن، لاہور (شمارہ نمبر ۳۱، ۳۰)، اجرا، کراچی (کتاب نمبر ۲۲، ۲۱)، کارواں، بہاول پور (جلد ۴۲، شمارہ ۴، ۳، ۲، ۱)، بیاض، لاہور (جلد ۲۳، شمارہ نمبر ۵)، فانوس، لاہور (جلد ۵۵، شمارہ نمبر ۶) میں شایع ہو چکے ہیں۔کچھ کہانیاں سیپ (کراچی)، دنیازاد (کراچی)، خرمن (ساوتھ افریقہ)، ادب و ثقافت (فیصل آباد)، لوح (اسلام آباد) کے مدیر ان کو بھی ارسال کر رکھی ہیں۔ان کا پہلا افسانوی مجموعہ ۲۰۱۸ء میں متوقع ہے۔مجوزہ نام "کہانی کافر" ہے۔

شاہین عباس کے افسانوں میں مرکزی خیال کسی کنکریٹ چیز کے طور پر دکھائی دیتا کہ پہلی سطر سے ہی کوئی سرا ہاتھ آجائے اور بعد کے تمام واقعہ کی بنیاد اس سرے پر استوار کی جاسکے۔مرکزی نکتہ ناپید ہو تو خیال کی بجائے احساس جنم لیتااور احساس کا کوئی حدود اربعہ نہیں ہوتا اسے پانی کی طرح جس برتن میں ڈالا جائے وہی شکل اختیار کر لیتاہے اور ہوا کی مانند دستیاب علاقوں میں پورے کا پورا سما جاتا ہے۔شاہین عباس کے افسانوں "ویرے کی یو"، "حجر سفیدی اور سیاہی"، "بیوہ کا بگھار"، "صفر کہیں نہیں"، "کیا ہے کیا نہیں"، سرخ آب سپر د خاک"، "ایڈیٹنگ"، اور "سڑک پار کرتے ہوئے"، اور "کرافٹ کے لوگ" کا محرک اور تھیم مختصراًیہ ہے۔

انسان تو جانوروں کی تربیت کرتا آیا ہے، مگر بعض اوقات جانور بھی انسان کی اصلاح کیلئے استعمال ہوتے رہے ہیں۔ہم اسے "ویرے کی یو" کا محرک قرار دے سکتے ہیں۔"حجر سفیدی اور سیاہی" میں قیامت کی بات کی گئی ہے اور خدا کی مخلوق کے مقابلے میں اپنی مخلوق کو لا کھڑا کرنے کا ذکر کیا گیا ہے۔"بیوہ کا بگھار" ی مرکزی لائن وہ ہے جس میں نگو، فرشتوں سے کہتی ہے کہ اس کے شوہر کو کنوارا ہی اوپر اٹھالیا گیا ہے۔'صفر کہیں نہیں' میں بظاہر تو جنس سے بیزاری کا رویہ ہے مگر اس کی ٹریٹمنٹ کچھ ایسی ہے کہ بعض مبصرین اسے فکشن سے آگے کی چیز قرار دیا ہے۔شاہین عباس کا یہ ایک اہم علامتی افسانہ ہے جس میں جنسیت پرستی کے عنصر کی انسانی معاشرت میں کار فرمائی کو ایک اچھوتے رنگ میں پیش کیا گیا ہے۔اس فن پارے میں ایک طرف یہ سوال اٹھایا گیا ہے کہ کہانی کی تخلیق کاری میں جنس اور زندگی کے تصور کو بالکل الگ کر کے فن پارے کی متنی تشکیل ممکن ہے۔دسری طرف اس صداقت کو عیاں کیا گیا ہے کہ انسانی سماج میں جنس اور صنف مخالف کی کشش ایک ایسا کائناتی مظہر ہے جس کو انسانی تہذیب و تمدن کی ارتقائی کہانی میں کسی طور پر نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔انسانی معاشرے میں رشتوں کی شناخت سے یہ جذبہ ماوراہے۔جنس مخالف کی کشش اور ذی روحوں کے وصال کی جادوئی کشش کے ذریعے یک

جاں ہو جانے کی ازلی تڑپ اور وجود کی دوئی کو مٹا دینے والی آتش کو بجھا دینا ممکن نہیں ہے۔اس افسانے کے بیانیہ کی رو سے جنسی جبلت (جنسی قوت) حیات و کائنات کے ارتقائی عمل میں ایک پر اسرار طاقت کی حیثیت رکھتی ہے۔'کیا ہے کیا نہیں' کی بنیاد اس احساس پر ہے کہ؛ہونے' اور 'نہ ہونے' کے تصورات کو کس طرح واہموں کی نذر کر دیا جاتا ہے۔" سرخ آب سپردِ خاک" بظاہر مرد کے عورت پر جبر کی قدیم داستان ہے۔کہانی میں یہ بتایا گیا ہے کہ مرد خود کو حاصل اختیارات کی بنیاد پر کس طرح عورت کے استحصال میں ملوث رہا ہے۔یوں دیکھنے میں وہ اپنے ہی اختیار کا استعمال کر رہا ہوتا ہے، مگر عورت کی زندگی سے کھیل کر۔ یہ ایک ایسا فن پارہ ہے جس میں مرد اور عورت کی ازدواجی زندگی کے متعلق تلخ حقائق کو عیاں کیا گیا ہے۔ یہ تلخ حقائق انسانی معاشرے میں حوا کی بیٹیوں کے مقدر میں ناکردہ گناہ کی سزا کے بھیانک روپ میں دکھائی دیتے ہیں اس افسانے میں شب عروسی کی واردات و کیفیات میں مرد کے حیوانیت زدہ رویوں کو بے نقاب کیا گیا ہے۔شاہین عباس نے اس فن پارے میں ایک ایسی سماجی حقیقت کو بے نقاب کیا ہے جس میں عورت مرد کے جنسی استحصال اور غیر انسانی رویے کی بدولت جسمانی اور روحانی اذیت ناکی کا شکار ہو کر زندگی سے بھی ہاتھ دھو بیٹھتی ہے اس کائنات میں اللہ تعالیٰ نے انسان کو اشرف المخلوقات بنا کر بھیجا ہے۔عورت اور مرد کو ایک دوسرے کا لباس اور فطری ضرورت بنا کر تخلیق کیا ہے لیکن یہ ایک زندہ سماجی المیہ ہے کہ مرد حس سے بڑھی ہوئی شہوت پرستی میں اندھا ہو کر سفلی جذبات کی تسکین کے لیے عورت کو ایک انسان کے بجائے ایک بھیڑیا بن کر اسے اپنی ہوس پرستی کا شکار بنا دیتا ہے۔ وہ اخلاقی اقدار کی تمام حدوں کو پامال کر کے عورت کے انسانی وقار کی دھجیاں بکھیر دیتا ہے۔ یہ کس قدر بھیانک سماجی رویہ ہے جس میں ایک شوہر اپنی ہی بیوی کو حقیقی محبت و پیار کے بجائے ایک بھوکے درندے کی طرح اس پر ٹوٹ پڑتا ہے اور شادی کی پہلی رات میں اپنی مردانہ وجاہت کی دھاک بٹھانے کے لیے اس کے روح و جسم کو تار تار کر دیتا ہے اس افسانے کی دوسرے فکری جہت ایک بہت بڑے اجتماعی ارضی المیہ کی عکاسی ہے جس کی رو سے اس کائنات میں انفرادی اور اجتماعی ہر دو سطحوں پر طاقت ور اور جابر کمزور اور بے بس انسانوں کا استحصال کرتے ہیں۔ یہ کائناتی صداقت وحشی درندوں کے علاوہ انسانی معاشرت میں بھی عام دکھائی دیتی ہے۔ "ایڈ نٹنگ" معنیاتی تہہ داری کا حامل علامتی افسانہ ہے جس میں فکر کے متنوع زاویوں کو ایک نامیاتی وحدت میں ڈھالنے کی کوشش کی گئی ہے۔افسانہ کے متن کی پہلی فکری جہت تخلیقی ادب کی تمثیل کا احاطہ کرتی ہے جس کی رو سے ایک نظر کے متن کی بنت کاری اور س کی ساخت کی تشکیل و تعمیر میں قطع و برید کی جبریت سے بحث کی گئی ہے یہ فکری زاویہ دراصل فرد اور معاشرے کے تعلق لاینفک اور جز و اور کل کے نظام میں انفرادی اور اجتماعی ارتقا پذیری کا ثبات پیش کرتا ہے جس کی رو سے معاشرے کے اجتماعی نظام (معاشرے کی قائم کردہ روایات و اقدار) میں فرد کی شخصیت کی تعمیر و تشکیل ہوتی ہے گویا فرد معاشرتی جبر ہی کی بدولت زندگی کے ارتقائی عمل سے آشنا ہوتا رہتا ہے۔ وہ معاشرے کے حصار کے اندر نہ صرف زندہ رہتا ہے بلکہ اس کی زندگی کے جملہ رنگ معاشرتی نظام ہی کے مرہون منت ہوتے ہیں نظم اور افسانے کی اصناف کو سامنے رکھتے ہوئے رزمیہ اور طربیہ کی تمثیل سے تخلیق کار نے معاشرے اور فرد کی ارتقائی کہانی کا ایک خاص زاویہ پیش کیا ہے۔ اس

افسانے میں جبر اور قدر کی فلاسفی کو ایک متوازی متن کے روپ میں ابھارا گیا ہے۔ شاہین عباس کے زیر تبصرہ افسانے کی معنیاتی توضیح کے حوالے سے ایک اور اہم فکری زاویہ جو سامنے آتا ہے اس میں ناسٹلجیا اور کلیشے کی اصطلاحات کو مرکزیت حاصل ہے۔ شعوری اور لاشعوری نفسیات کی رو سے یہ افسانہ شخصیت و کردار کی تعمیر و تشکیل، حیاتیاتی اور تخلیقی عمل کی پراسراریت کا بیانیہ ہے۔ جس کے مطابق انسانی وجود ایک خاص زمان و مکاں سے وابستہ ہے لیکن انسانی جوہر (روح) زمان و مکاں کی حد بندیوں سے ماوراء ہے۔ انسانی ذہنی و کرداری رویوں کی تشکیل معاصر معاشرت اور اس کے جدلیاتی شعور کے زیر اثر ہوتی ہے۔ انسان جسمانی طور پر ایک خاص مقام اور معاشرت سے وابستہ ہوتا ہے لیکن تصور اور خیال میں انسان آزاد ہے، وہ جسمانی طور پر ایک جسم سے جنسی انسلاک (جنسی سرگرمی) کے دوران ہزاروں پیکر حسن و جمال کے تخلیاتی وصال (تصور جنسی سرگرمی) سے لطف اندوز ہو سکتا ہے اسی تخلیقی عملی کے دران جب وہ روح عصر کو اپنی ذات کے بطون میں جذب کر چکا ہوتا ہے تو ایک تخلیق کار فکر و خیال کے ان گنت زاویوں سے فن پارے کے متن کی تشکیل کر کے فکر و خیال کے ایسے جہاں آباد کر لیتا ہے جس کو ایک صاحب ذوق قاری معنیاتی توضیح کے دوران عیاں کرنے کی سعی کر کے تخلیق مکرر کا عمل پایہ تکمیل کو پہنچانے کی حتی المقدور کوشش کرتا ہے۔ تخلیقی متن میں جزو اور کل کا ایک آفاقی ساختیہ کار فرما ہوتا ہے۔ نظم یا کسی بھی فن پارے کے متن میں موجود لفظ کی معنیاتی توضیح تناظر سے مشروط ہوتی ہے اور یہ کہ لفظ اور معانی کا رشتہ حتمی اور آخری نہیں ہوتا بلکہ اس کا انحصار کوڈ اور کنوینشن سے عبارت ہوتا ہے جس طرح ایک تخلیقی متن میں ساختیہ کی تشکیل میں کار فرما لفظوں کے نیستی تعلقات (تناظر) سے معانی کے استخراج کی سعی کی جاتی ہے جس کی آخری حد نہیں ہے ایسے دیکھنے والی آنکھ اور سوچنے والے ذہن کا زاویہ نظر اپنی تنقیدی بصیرت سے وہ کچھ دیکھ سکتا ہے جو ایک سطحی قاری کے احاطہ ءادراک سے باہر ہوتا ہے۔ اس تناظر میں انسانی معاشرت میں انسان جس زاویہ نگاہ سے ادراک حقیقت پانے کی سعی کرتا ہے اس کے سامنے وہی زندہ حقیقت بن جاتی ہے اس افسانے کا بیانیہ یہ ہے کہ عقل و شعور کے ذریعے حیات و کائنات کی پراسرار گرہیں کھلتی جاتی ہیں لیکن کائنات خارج کا متن ہو یا کائنات باطنی کا متن، دونوں میں ادراک عمل گرہ در گرہ آگے بڑھتا تو ہے مگر حیرت و استعجاب کی منزلیں جست در جست پھیلتی چلی جاتی ہیں جن اذہان کو فرق کا ادراک نہیں ہوتا (بے علم) وہ سکوت و جمود کی خامشی میں گم رہتے ہیں اور جن کو خیر و شر، حق و باطل جفت و طاق اور لفظ و معانی کی انفرادیت کو اجتماعیت کے دائرے میں دیکھنے کا جنون ہوت ہے وہ تحرک وارتقا کے عمل میں آگے ہی آگے بڑھتے چلے جاتے ہیں۔ یہ فن پاری معنیاتی حوالے سے فکر کی ان گنت روشنیوں سے منور ہے۔

افسانہ ایڈیٹنگ ایک کثیر الجہت متن کا حامل فن پارہ ہے جس میں جزو اور کل کا دلکش امتزاج ہے۔ متن کی تشکیل متنوع فکری زاویوں کے حامل زیریں متون کو ایک ارتقائی وحدت میں پرو کر کی گئی ہے اس فن پارے کے مہابیانیہ کی رو سے انسان نے مادی اور سائنسی ترقی میں اوج کمال حاصل کر کے تسخیر خلا کے عمل میں قدم رکھ لیا ہے۔ تہذیب و تمدن اور جغرافیائی شناختیں اپنی شناخت میں نئی معنویت کی حامل ہو چکی ہیں اس وقت تمام دنیا ایک گلوبلائزیشن کی تہذیب کا روپ

دھار چکی ہے لیکن روحانی طور پر انسان آج بھی عدم جو ہریت اور عدم شناخت کا شکار ہے۔ نام نہاد تہذیب جدید کار کن ہونے کے باوجود اسے نفرت، خوف دکھ اور جنسی اور نسلی استحصال کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ آک کا انسان اپنی ذات کی عدم شناخت انسانی رشتوں کی پامالی بالخصوص مرد وزن کے فطری تعلق کی نا آسودگیوں کا شکار ہے آج کا انسان تمام تر مادی ترقیوں کے باوجود اندر سے کھوکھلا اور روحانی نا آسودگی کا شکار ہے۔ یہی صداقت شاہین عباس کے اس فن پارے کا مرکزی بیانیہ ہے۔

شاہین عباس کا افسانہ "کرافٹ کے لوگ" ایک عمدہ اور معنیاتی تہہ داری کا حامل فن پارہ ہے جس میں قدامت پرستی اور جدیدیت کی متضاد تمثالوں کے ذریعے جدلیاتی شعور کے ارتقائی تسلسل اور جنسی رویوں کی کہانی کو پیش کیا گیا ہے۔ "کرافٹ کے لوگ" کی کہانی کا ایک نمایاں فکری زاویہ فطری جنسی تعلقات سے عبارت ہے۔ سماجی تناظر میں غیر فطری جنسی تعلقات کی صورت حال سے جنم لینے والا منظر نامہ اور فکری رویے اس فن کا مرکزی بیانیہ ہے۔ تہذیب و تمدن کے ارتقائی تناظر میں دیکھا جائے تو یہ صداقت عیاں ہو جاتی ہے کہ غیر فطری جنسی تعلقات ہر عہد کا المیہ رہا ہے۔ معاشرتی نظام میں جنسی بے راہ روی کا ناسور ابتدائی طور پر معاشرے میں جب سرایت کرتا ہے۔ تو اس کے آثار بظاہر دکھائی نہیں دیتے لیکن جوں جوں یہ ناسور زور پکڑتا جاتا ہے پھر یہ بیماری معاشرتی زندگی اس قدر عام ہو جاتی ہے اس کا تعفن نا قابل برداشت حد تک بڑھ جاتا ہے ایسی صورت حال میں جنسی بے راہ روی گھر۔ معاشرے اور فطری رشتوں کی حدوں کے امتیاز کا مٹا دیتی ہے۔

شاہین عباس کے افسانے "کرافٹ کے لوگ" کا دوسرا اہم فکری زاویہ یہ ہے کہ مذہب، سیاست، معاشرت وغیرہ میں انسانی تہذیب و تمدن قدامت پرستی کا شکار ہے۔ ظاہری طور پر انسانی معاشرے ارتقائی کروٹیں بدلتے دکھائی دیتے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ انسانی معاشرت ذہنی و فکری رویوں اور جبلتوں (خوف، غم، دکھ، جنس وغیرہ) کے حوالے سے ابھی تک اپنی ازلی منزل پر ہی رکی ہوئی ہے۔ مراد یہ ہے کہ انسان نے جس طرح پہلے حیوانیت اور درندگی کے رویے اپنائے ہوئے تھے آج بھی وہ اپنے آپ کو ان غیر انسانی اور غیر مہذب رویوں سے آزاد نہیں کر پایا۔ اس افسانے کے تمام کردار حافظ جمال دین ہاشو، نانک، اکو چنگڑا، اچھو چنگڑا، بھاوج نوراں، زاہدہ بیگم، بوبی، چھوٹی چاچی، رسولاں دائی اور سرداروں وغیرہ سب کے سب کنویں کے مینڈک دکھائی دیتے ہیں۔ وہ ظاہری تبدیلیوں کے باوجود ایک ہی سانچے میں ڈھلے ہوئے ہیں۔ خیر و شر، نیکی و بدی، محبت و نفرت، خلوص و منافقت وغیرہ جملہ ذہنی و کرداری ریوں میں ان سب کا جمود انسانی تہذیب و تمدن کی جمودی تمثیل ہے۔ بظاہر روشن نظر آنے والے چہرے اندر سے کالے ہیں بظاہر نیک دکھائی دینے والے لوگ اندر سے بدخصلت ہیں، یہ لوگ اپنی جھوٹی انا کی تسکین کے لیے اپنی ذات اور ضمیر کو مسخ کر دینے والے ہیں۔ جنسی بے راہ روی گھر، رشتوں اور چادر اور چار دیواری کی حدوں سے ماورا ہو چکی ہے۔ یہ معاشرہ جدید معاشرت کا زندہ نمونہ ہو کر بھی جنگلی تہذیب کا منظر نامہ پیش کرتا ہے۔

شاہین عباس کے اس افسانے کے بیانیہ کی رو سے انسان نے عقلی اور مادی حوالے سے بے پناہ ترقی کر کے خلائی تسخیر کا سفر شروع کر لیا ہے لیکن روحانی اور باطنی طور پر انسان خیر و شر کی ازلی کشمکش میں ایک مرغ بسمل کی طرح ہے۔ ان کی

بنیادی نفسی جبلتیں ہوس پرستی منافقت، ریاکاری اور جنس پرستی وغیرہ نے اسے اپنے آہنی شکنجوں میں جکڑا ہوا ہے۔ تاریخی ارتقا کے تناظر میں جغرافیے، تہذیبیں، مذاہب اور معاشرے کہاں سے کہاں تک جا چکے ہیں لیکن روحانی طور پر انسان ایک تاریکی کے جنگل میں کھڑا ہے۔ جنسیت پرستی اور نفس پرستی کے ناگ پھن پھیلائے وجود آدم کو پل پل ڈس رہے ہیں ان کے سامنے اخلاقی اور روحانی اقدار میں ریت کے گھروندے بن چکی ہیں۔ اس ساری صورت حال میں ایسے لگتا ہے کہ انسانیت ازل سے ابد تک خیر اور شر کی کشمکش میں ایک ہی سانچے میں ڈھل چکی ہے۔ جس قدامت (جمود) کا ایک ایسا پہرہ ہے جس سے اس کی رہائی ممکن نہیں۔

"ایڈیٹنگ" کہانی کا ایک پہلو تو ہر لمحہ بدلتی ہوئی زندگی میں کسی ایک صورت حال پر قناعت نہ کرنے کا رویہ ہے۔ دوسرا پہلو انفرادی Confusion اور Illusion کا نکلتا ہے جن کا شکار مرکزی کردار کسی بھی سزا کے لیے تیار ہو جاتا ہے۔ "سڑک پار کرتے ہوئے" ایک عالمی موضوع کو محیط ہے۔ یہ بین المذاہب ہم آہنگی کے تصور پر مبنی کہانی ہے جس میں فزکس کے قانون بقائے مادہ کو موضوع بنا کر کثیر البنیاد معاشروں میں مذاہب کی بدلتی ہوئی صورتوں کو دیکھنے کی سعی کی گئی ہے کہانی میں یہ سمجھانے کی کوشش کی گئی ہے کہ کس طرح ایک تصور، کلیت یا اکائی کو متاثر کیے بغیر دوسرے تصور میں بدل سکتا ہے، مگر اس کا ادراک بہت کم لوگوں کو ہوتا ہے۔ شاہین عباس کے ہاں معلوم کو نامعلوم اور موجود کو موہوم بنانے کی دھن بھی ملتی ہے جس سے احساس ہوتا ہے کہ فنا یا موت کا احساس ان کا مرکزی تخلیقی تجربہ ہے۔ شاہین عباس کے قلم کا سحر ابھی اردو افسانے میں اعجاز کی مزید نیرنگیاں دکھائے گا۔ ان کے افسانے "حجر۔ سفیدی اور سیاہی" پر تبصرہ کرتے ہوئے حنیف سرمد نے لکھا:

> "شاہین عباس کا افسانہ "حجر، سفیدی اور سیاہی" تخلیق آدم کی ازلی و ابدی کہانی کا وہ بھیانک روپ عیاں کرتا ہے جس کی رو سے ابن آدم نے حیات و کائنات کے اسرار کی عقدہ کشائی میں خود کو عقل و دانش کے اس گنجلک میں ڈال دیا جس میں گناہ اور ثواب، خیر اور شر، حلال اور حرام کی تمیز سے تہی دست ہو کر مادی ارتقا کی اندھی روش پر چلنے کے باعث وہ روحانی ارتقا کی اہلیت سے محروم ہو گیا۔ مادہ پرستی اور بے لگام عقلی استدلال نے اسے گمراہی اور تباہی کے جہنم میں دھکیل دیا ہے۔ مشرق و مغرب کے مادی اور عقلی افکار کی رو سے حیا اور بے حیائی، حجاب اور بے حجابی کی نام نہاد تاویلوں اور جنس پرستی کے ناسور نے ابن آدم کی حقیقی شکل و صورت مسخ کر کے رکھ دی ہے۔ وہ بقا اور فن کی لاحاصل تاویلوں میں جکڑا جنسی بے راہ روی کی ایسی دلدل میں غرقاب ہو گیا ہے جس نے ایک شجر ممنوعہ کی طرح اسے اپنی جڑوں کے شکنجے میں پھنسا کر اذیت ناک کیفیت میں مبتلا کر دیا ہے۔ اس فن پارے کے بیانیہ کی رو سے خود کو عقل و دانش کا

دیوتا سمجھنے والا ابن آدم بے راہ روی کی دیمک کے طفیل ذلت اور پستی کی قبر میں مٹی کا ڈھیر بن چکا ہے"۔ (۶)

شاہین عباس نے افسانہ نگاری کے آغاز سے پہلے فرانز کافکار، مارکیز، بورخیس، قراۃ العین حیدر، نیر مسعود، میلان کنڈیر اور چیخوف کو جم کر پڑھا۔ ہمیں ان تمام افسانہ نگاروں خصوصاً کافکا ار نیر مسعود کے اثرات ان کی افسانہ نگاری پر مرتب نظر آتے ہیں۔ کہانی کی فضابندی کا درس انھوں نے انھی افسانہ نگاروں سے لیا ہے۔ اردو میں جب افسانہ لکھا جانے لگو تو کہانی، پلاٹ، مکالمہ، کردار وغیرہ کی ایک خاص اہمیت تھی۔ پھر ایسے تجربے بھی ہوئے کہ جن میں افسانوی متن کو کسی نقطۂ آغاز اور انجام کے درمیان قید نہیں کیا گیا۔ یوں کہانی کے تسلسل اور وحدت تاثر کی روایتی صورت حال میں تبدیلیاں آئیں۔ شعور کی رو، جادوئی حقیقت نگاری، سریلزم اور تجر دیدیت پر مبنی افسانوی ٹیکنیکس کی بدولت متن سے وابستہ تفہیم و توضیح کے ابتدائی تصورات پر از خود نظر ثانی ہوتی چلی گئی۔ جس سے اردو افسانے کے لیے ایک نئی فضا بندی کا راستا کشادہ ہوا۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ فضابندی، ڈکشن اور کرافٹ ان کے نزدیک فکشن کی بنیادی ضروریات ہیں۔ یہ تینوں عناصر ہمیں ان کے افسانوں میں واضح طور پر دکھائی دیتے ہیں۔ افسانہ نگاری میں ان کے پسندیدہ موضوعات کیا ہیں، اس سوال کے جواب میں انھوں نے ہمیں بتایا:

"سوسائٹی کے ممنوعہ اور ناپسندیدہ موضوعات ہی میرے پسندیدہ ہیں جب زندگی اور بندگی کے کسی رُخ کو سیاسی یا مذہبی اشرافیہ بزور بازو رد کر دیتا ہے تو میں راندہء درگاہ کو اپنی کہانی سمجھ کر اٹھا لیتا ہوں اور احوال پوچھنے پر چلتا ہے کہ محض کپڑے پلید تھے، اس لیے یہ سلوک روا رکھا گیا۔ میں اس پلیدی کو پاکی میں نہیں بدلتا بلکہ وہ تو پہلے ہی اس میں موجود ہوتی ہے اور از خود میرے موضوعات کا حصہ بنتی چلی جاتی ہے"۔ (۷)

شاہین عباس کے افسانوں میں تخلیقی ابہام موجود ہے، جس سے بعض اوقات ان کے قاری کو ان کا افسانہ پورے طور پر سمجھنے میں دشواری پیش آتی ہے ان کے افسانوں کا مطالعہ کرتے ہوئے ہمیں بھی اسی مشکل کا سامنا رہا۔ اس لیے ہم نے ان سے یہ پوچھ کہ ان کے افسانوں کی تفہیم کے لیے ہمیں کیا کرنا چاہیے؟ اس کے جواب میں انھوں نے بتایا کہ:

"ہمیں یہ احساس کرنا ہوگا کہ افسانے کی قرات اور سماعت کے تقاضے غزل کی قرات و سماعت سے یکسر مختلف ہیں۔ ہر بڑا مصنف، نثر نگار ہو یا شاعر، قاری سے مخصوص قرات کا مطالبہ کرتا ہے جو تفہیم میں معاون ثابت ہوتی ہے۔ مجید امجد جیسے شاعر کے ذہن میں بھی اپنی نظموں کی قرآت کا ایک خاص تصور تھا، جس کا وہ اپنے قاری سے بھی مطالبہ کرتے تھے۔ اگر میرے افسانے کا قاری پرانے افسانوی اسلوب اور قرات کو معیار سمجھ کر مجھے پڑھے گا تو اسے جھنجھلا ہٹ کے سوا کچھ بھی حاصل نہیں ہوگا۔ مجھے بطور شاعر بھی یہ احساس رہتا ہے کہ میرا سامع یا

قاری کس قدر اپ ٹو ڈیٹ ہے اور بطور کہانی نویس بھی میرے نزدیک اس بات کی بڑی اہمیت ہے۔ یہ بات میں اس لیے کہہ رہا ہوں کہ قاری کسی بھی متن کی بار دگر تخلیق کرتا ہے، یہ دوسری تخلیق پہلی سے بہتر ہو تو خود مصنف کے لیے رہنمائی کا کام کرتی ہے، بری ہو تو گمراہی کا موجب بن جاتی ہے جس طرح قاری کے پاس کسی ادب پارے کو جواز یا جواز کے بغیر بھی مسترد کرنے کا اختیار ہے، اسی طرح مصنف کے پاس بھی یہ اختیار ہے (یا ہونا چاہیے) کہ وہ قاری کی ذہنی استعداد کو معرض سوال میں لا کر اس کی تربیت کار استا نکالے"[۸]

شاہین عباس کہانی کی فطرت کے راز دار ہیں۔ ان کے ایک ایک جملے سے تاریخی اور عصری شعور جھانکتا اور اظہار کے نئے امکانات تلاش کرتا دکھائی دیتا ہے ان کے افسانوں کی زمانی وسعت، مکانی پھیلاؤ اور مواد کی بے کران کو مختصر ترین افسانچے میں قید نہیں کیا جاسکتا۔ اس لیے ان کے ہاں افسانوں میں طوالت آمیز رجحان واضح طور پر دیکھا جاسکتا ہے۔ بہ حیثیت مجموعی انھوں نے اردو افسانے کو معنوی اور موضوعی، دونوں حوالوں سے آگے بڑھایا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ ایک نئی زبان تشکیل دی ہے۔ اسالیب نثر کا تنقیدی جائزہ لینے والوں کے لیے یہ زبان ایک نئے امکان کے در وا کر رہی ہے۔ اس پر توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ نئے اردو افسانے کے حوالے سے ڈاکٹر اعجاز راہی کی رائے یہ ہے کہ:

"نئے اردو افسانے زندگی کو وسیع تناظر میں دیکھنے کی روایت قائم کی اور اس کے لیے اس نے نہایت توانا نامیاتی اسلوب اور ڈکشن کو استعمال کیا۔ جس میں نئے موضوع و کردار کو زندہ پیکروں میں مجسم کرنے والی پوری صلاحیت اور اس کے اندر غیر مرئی قوت کا ایک بے پایاں استدلال اور وسعت موجود تھی۔ چنانچہ معنیاتی انسلاکات و استدراک کے لیے استعاراتی، علامتی، تمثیلی اور پیکری تہ در تہہ محاکات کا تخلیقی محاکمہ نئے افسانے کے اسلوب اور بنت کا حصہ بنا۔ معمول کی لفظیات کے استعمال کے انکار سے نئے افسانے کی نئی لفظیات نے نئی لسانی تشکیلات کی ایک عملی شکل وضع کی اور ادب کو لفظیات کا ایک نیا ذخیرہ مہیا کیا۔ یہ سارے عناصر مل کر نئے افسانے کو اظہار کے لیے ایک وسیع کینوس مہیا کرتے ہیں"۔[۹]

کم و بیش اس رائے کا اطلاق ہم شاہین عباس کے افسانوں پر بھی کر سکتے ہیں۔ شاہین عباس کا تصور حیات و کائنات نہ صرف ان کی غزل، نظم بلکہ افسانوں میں بھی دیکھا جاسکتا ہے۔ شاہین عباس عام قاری کا افسانہ نگار نہیں ہے، وہ پختہ ادبی ذوق کے قاری کا افسانہ گار ہے، ان کا زرخیز تخیل مسلسل بروئے کار رہتا ہے اور تخلیق کا سلسلہ کبھی شروع تو کبھی افسانہ نگاری میں ڈھل جاتا ہے انہوں نے جس زمانی ترتیب سے افسانے لکھے، نیچے درج کیے جا رہے ہیں۔

۱۔ بیوہ بگھار

۲۔ کرافٹ کے لوگ

۳۔ ایڈیٹنگ
۴۔ لیمہ یکہ بان
۵۔ سرخ آب سپردِ خاک
۶۔ خط کا خاکی
۷۔ کیا ہے کیا نہیں
۸۔ صفر کہیں نہیں
۹۔ امانت سولہ آنے
۱۰۔ سڑک پار کرتے ہوئے
۱۱۔ حجر، سفیدی اور سیاہی
۱۲۔ ویرے کی بو

ان کے زیادہ تر افسانے فکر و فن کے اعلی معیارات پر پورے اترتے ہیں اور ہمیں یقین ہے آگے چل کر یہ افسانے اپنے عہد اور اس عہد کے ذہن کی تاریخ بن جائیں گے۔ تاریخ ہی نہیں، تفسیر بھی، اردو افسانے کا جو نیا منظر نامہ مرتب ہو رہا ہے اس میں کئی دیگر لکھنے والوں کے ساتھ ساتھ شاہین عباس کا نام بھی نمایاں ہو گا۔

یہ بات درست ہے کہ اردو افسانہ مغرب کی دین ہے لیکن گزشتہ صدی کے دوران میں اس نے اردو میں اپنی زمینی رشتے اتنے گہرے اور وسیع کر لیے ہیں اس کے خدوخال مغربی افسانے کے خدوخال سے یکسر جدا ہو چکے ہیں اردو میں افسانہ نگاری کی صنف نے تخلیقی نمو پذیری کی جو مثال قائم کی ہے وہ کسی اور صنف ادب کو شاید ہی نصیب ہو سکی ہو۔ انسانی زندگی میں تغیر و تبدل ناگزیر حقیقت ہے۔ معاشرت، سیاست، اقتصادی رشتے اور ٹیکنالوجی سے زمانے کی رو میں فرق پڑتا ہے یہ فرق ادب میں ابھر کر سامنے آتا ہے کیونکہ ادب ان تغیرات سے بے بہرہ نہیں رہ سکتا۔ مابعد جدید افسانہ انھی تبدیلیوں کا عکاس ہے یہ افسانہ سماجی عوامل سے آنکھیں نہیں چراتا، موضوعات کا انتخاب اس کا مسئلہ نہیں اور یہ کسی ایک تکنیک کا پابند نہیں ہوتا۔ مابعد جدید افسانے کا یہ رویہ انحراف نہیں، انجذاب کا ترجمان ہے شاہین عباس نے صنف افسانہ کے تسلیم شدہ سانچے توڑے ہیں ان کے ہاں ایک نئی افسانوی زبان کا استعمال اور اس کا تخلیقی آہنگ واضح طور پر محسوس کیا جاسکتا ہے۔

افسانہ ایک تخلیقی اکائی ہے اور اس سے ہر صاحب قلم انصاف نہیں کر سکتا۔ تاہم ہمیں یہ کہنے میں کوئی باک نہیں کہ افسانوی تکنیک اور ٹریٹمنٹ کے لحاظ سے شاہین عباس ایک کامیاب افسانہ نگار ہیں، جس کے افسانے اپنے نو بہ نو تجربات کی وجہ سے تادیر زندہ رہنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔

عصر حاضر کے معروف نقاد ڈاکٹر ناصر عباس نیر کی شاہین کے افسانوں کے حوالے سے یہ رائے بڑی وقیع ہے۔ ملاحظہ کیجیے:

> "اردو غزل میں ایک نیا لہجہ، ایک نیا اسلوب اور ایک نئی حسیت کے ذریعے امتیاز حاصل کرنے والے شاہین عباس کو غالب کی مانند احساس ہوا کہ بقدر شوق نہیں ظرف تنگنائے غزل۔ چنانچہ شاہین عباس نے آزاد نظم لکھنا شروع کی۔ وہ غزل سے دور نہیں ہوئے، لیکن اسی تخلیقی ارتکاز کے ساتھ نظم بھی لکھنے لگے۔ ان کی نظم، جدید نظم کی شعریات کی حدوں کو کھوجتی اور کہیں انھیں توڑتی اور ایک اپنا راستہ اختیار کرتی نظر آتی ہے۔ جلد ہی انھیں نظم کی تنگنائے کا احساس ہوا اور انھوں نے فکشن لکھنا شروع کیا۔ غزل کے شاعر کے لیے نظم اور فکشن دونوں مبارزت طلب ہوتے ہیں لیکن شاہین عباس کے یہاں، ایک ایسا غیر معمولی اضطراب ہے جو انھیں کسی ایک صنف میں محدود ہو جانے سے روکتا ہے یہ اضطراب بھی دنیا میں عدم شناخت یا توقع سے کم پذیرائی کا رد عمل نہیں ہے اور نہ ہی نئے سرے سے، ایک اور صنف کے ذریعے شناخت حاصل کرنے کی خواہش سے عبارت ہے۔ یہ اضطراب خود کو، دنیا کو، خدا کو اور ان سب کے رشتوں کے تاریخی ااور وجودی بیانیوں کی تھاہ پانے کی آرزو کا زائدی ہے۔ اس آرزو کو دل میں جگہ دینا آسان نہیں اور اسے اپنے فکشن میں منتقل کرنا تو نہایت ہی جرات آزما کام ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کا فکشن واقعات کی سادہ عکاسی نہیں ہے بلکہ ان کا فکشن واقعے کی عکاسی یا سماجی حقیقت نگاری کو مسلسل Subvert کرتا محسوس ہوتا ہے۔ ان کے افسانے کسی مانوس اور جانی پہچانی دنیا کو پیش نہیں کرتے، بلکہ اس سر رئیلی دنیا سے معاملہ کرتے محسوس ہوتے ہیں، جسے محض عقل گرفت میں لے سکتی ہے، نہ روایتی زبان، یہی وجہ ہے کہ ان کے افسانوں کو پڑھتے ہوئے ایک طرف وقت کا مستقیمی تصور اور فکر کا سیدھے خط کا انداز، ایک طرح سے مغزولی کے عمل سے گزرتے ہیں اور دوسری طرف زبان اپنے معنیاتی کناروں سے باہر بہتی ہوئی اور کناروں کو اپنے ساتھ بہالے جاتی ہوئی محسوس ہوتی ہے ان افسانوں کو واقعے کی ترجمانی کے طور پر نہیں، انسانی وجود کے بنیادی سوالوں، نیز تاریخی واساطیری تشکیلات پر انسانی تجربے کے قائم کیے گئے big question marks سمجھ کر پڑھا جانا چاہیئے"۔ (۱۰)

یہ کہنا شاید مبالغہ نہ ہو گا کہ معاصر افسانہ دراصل مابعد جدید افسانہ ہے اور یہ رویہ ایک رجحان کی شکل اختیار کر چکا ہے، تاہم اسے ایک تحریک بننے میں ابھی کچھ وقت لگے گا۔ آج کا مابعد جدید افسانہ جیتے جاگتے اور زندگی کی حقیقتوں سے سرشار کرداروں سے مزین ہے۔ مابعد جدید افسانی تکنیکی جمود کو توڑتا ہے اور کسی خاص اسلوب یا موضوع پر زور نہیں دیتا۔

اس کے ہاں سیاسی احتجاج کی تکرار نہیں ہے۔ مابعد جدید افسانے میں حقیقت،، فن تا سی اور یاد سے بیک وقت کام لیا جاتا ہے۔ یہ پوری زندگی سے نہ صرف وابستہ بلکہ پیوستہ ہے۔ آج کا افسانہ افسانی صورت اختیار کرتے ہوئے آج کی عمومی زندگی کے کھر درے پن اور ٹھوس پن سے آنکھیں چار کر رہا ہے۔ یہ افسانی توسیعی ذخیرے میں رنگارنگ تجربات کا اضافہ ثابت ہو رہا ہے۔ مابعد جدید افسانے زندگی اور افراد کو ان کی Totality میں پیش کیا ہے۔ یہ افسانہ کلیشے کے استعمال سے گریزاں ہے۔ اس میں علامت و ابلاغ مصافحہ کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ یہ افسانہ تخلیقی صنف ہے جس میں بیک وقت فکر، استدلال، شعور، لا شعور، واردات قلبی، ادراک اور وژن، رچے بسے اور گھلے ملے ہوتے ہیں۔ اسی لیے تمام تخلیقی اصناف میں اسی صنف کو آج کی زندگی کے تناظر میں بیش قیمت رول ااور اہمیت تسلیم کرنا پڑتی ہے۔ زندگی اور انسانی سائیکی کی تصویر گری کے لیے اس سے بہتر کوئی اور تخلیقی صنف نہیں ہو سکتی۔ آج کے افسانے کو ریڈیکل افسانہ، مابعد جدید افسانہ یا اکیسویں صدی کا افسانہ خواہ کوئی بھی نام دے دیا جائے، اس کا اولا افسانہ ہونا زندگی اور قاری سے جڑا ہوا ہونا ہی اسکی معراج ہے۔ شاہین عباس افسانہ نگاروں کے اسی قافلے میں شامل ہیں جو اکیسویں صدی کی تخلیقی نقش گری کر رہا ہے۔

امتزاجی تنقید کے حوالے سے اپنا نام بنانے والے ایک نوجوان نقاد حنیف سرمد نے ان کے افسانوں کے بارے میں اپنی رائے کا اظہار ان الفاظ میں کیا ہے:

> "شاہین عباس کے ان افسانوں کے فکری و فنی مطالعے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ وہ فن پارے کی متنی تشکیل کے فطری تقاضوں کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے حقیقت نگاری، علامت نگاری اور آزاد تلازمے وغیرہ کی تکنیک سے استفادہ کرتے ہیں اس کے علاوہ افسانے کے متن کی طلب کے مطابق پلاٹ کی تشکیل میں امتزاجی عنصر کو بھی بروئے کار لانے کا دست ہنر رکھتے ہیں۔ شاہین عباس کو افسانے کے بیانیہ کی واقعاتی و سانحاتی صورت حال کی مناسبت سے اکہرے یا کثیر الجہت پلاٹ کی تشکیل و تعمیر میں بھی خاص مہارت حاصل ہے۔ شاہین عباس کے افسانوں میں کرداری نفسیات کا گہرا ادراک پایا جاتا ہے۔ ان کی کہانیوں کے جو کردار ہمارے سامنے آتے ہیں ان کی حرکات و سکنات ان کے ظاہری اور باطنی شخصی رویوں اور کیفیات کی ہم آہنگی کا منظر نامہ پیش کرتے ہیں۔ شاہین عباس کے افسانوی اسلوب میں فکری پہلو داری کے ساتھ ساتھ تخلیقی رعنائی بدرجہ اتم موجود ہے۔ ان کے افسانے خیال و جذبے کی نامیاتی وحدت کے عکاس ہیں۔ شاہین عباس نے اپنے افسانوں میں انسانی معاشرت کے خد و خال کو منفی اور مثبت دونوں حوالوں سے ارضی صداقت کے روپ میں پیش کیا ہے ان کے افسانے زمان و مکاں کی قیود میں پابند ہون کے بجائے انسانی تہذیب و تمدن کی ارتقائی تاریخ کے ساتھ ساتھ کروٹیں بدلتے دکھائی دیتے ہیں یہ فن پارے وقت کی دھول میں میلے ہونے کے بجائے فکر و

خیال کی سچائی، تر و تازگی اور معنیاتی تہہ داری کے باوصف نئی معنویت کے امکانات کے متحمل دکھائی دیتے ہیں امید ہے کہ شاہین عباس کا یہ تخلیقی سفر مزید آگے بڑھے گا۔ شاہین عباس اردو افسانے کی عصری روایت کا ایک اہم تخلیق کار ہے جس کے فکر و فن کو اردو افسانے کی روایت میں قدر کی نگاہ سے دیکھا جائے گا"۔(۱۱)

اور حرفِ آخر یہ ہے کہ علم کی، روشنی کی رفتار سے پھیلتی سرحدوں اور تخصیص(Specialisation) کی سکڑتی دنیا کے درمیان رابطہ صرف کہانی کارہ گیا ہے۔ علم کے وفور (Knowlwdge Explosion) کی اس صدی میں اور اس ڈیجیٹل عہد میں آدمی اپنے بنیادی سوالوں سمیت تیزی سے پھیل سکڑ رہا ہے۔ اس صورت حال میں کلام کرنے کے لیے غیر معمولی جرات کی ضرورت ہے۔ شاہین نے اپنے افسانوں میں اسی جرات کا مظاہرہ کیا ہے۔ ہستی کے گہرے سمندر میں غواصی کسی بھی زبان کے ادب میں روز مرہ کا واقعہ نہیں۔ اردو ادب میں شاہین عباس کی کہانیاں ممکنات کے ایک نئے براعظم کا درجہ رکھتی ہیں۔ کثیر تعداد میں لکھی گئی بے معنی تحریروں اور جعلی ادبی تحریکوں کے سامنے پسپا ہوتے قارئین کی اقلیت کے لیے نثری جرات اور لطافت سے معمور شاہین کی منفرد کہانیاں سوچ کا ایک نیا دروازہ کھولتی ہیں طاقتور دل و دماغ کی یہ تخلیقات ایسے قاری کی طلب گار ہیں جس نے ادب کا بہت گہرا اور مربوط مطالعہ کر رکھا ہے۔ یہ کہانیاں نہ Casually لکھی گئی ہیں نہ انھیں Casually پڑھا جا سکتا ہے۔ موضوعات اور مسائل کے انتخاب کے حوالے سے تخلیق کار کے پاؤں مضبوطی سے زمین پر جمے ہوئے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ شاہین عباس کی تخلیقات میں ایک نئی اردو صورت پذیر ہو رہی ہے انھوں نے زبان کے سلسلے میں بڑے اجتہاد سے کام لیا ہے۔ قارئین ادب کو چاہیے کہ وہ شاہین عباس کے اسلوبِ تحریر سے بھڑک اٹھنے کی بجائے اس سے مانوس ہونے کی کوشش کریں۔ کچھ دیر کے بعد یہ اسلوب نگارش انھیں خود ہی اپنی گرفت میں لے لے گا۔

حوالہ جات

۱۔ شاہین عباس تحریری انٹریو ۱۰ دسمبر ۲۰۱۵ء

۲۔ ایضاً

۳۔ شاور اسحاق کی درس دھارا کے فلیپ پر درج رائے

۴۔ اقتباس افسانہ حجر سفیدی اور سیاہی

۵۔ شاہین عباس تحریری انٹرویو ۱۰ دسمبر ۲۰۱۵ء

۶۔ حنیف سرمد "کاغذی پیرہن"، جنوری، فروری ۲۰۱۶ء

۷۔ شاہین عباس تحریری انٹرویو، ۱۰ دسمبر ۲۰۱۵ء

۸۔ ایضاً

۹۔ ڈاکٹر اعجاز راہی، "تیسری ہجرت"، دستاویز پبلی کیشنز، راولپنڈی، ص:۶۸

۱۰۔ ڈاکٹر عباس نیر، ای۔ میل بنام راقم ۲۵ مئی ۲۰۱۶ء

۱۱۔ حنیف سرمد مکتوب بنام راقم، ۳۱ مئی ۲۰۱۶ء